بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جمہوریت کو خطرہ ـــ مگر کس سے؟

پروفیسر خورشید احمد

۲۰۱۶ء اس حیثیت سے یاد رکھا جائے گا کہ پورے سال میں مختلف حلقوں کی طرف سے 'جمہوریت کو خطرہ ہے' کی گھنٹیاں بجائی جاتی رہی ہیں۔ ستمبر اور نومبر تو وہ مہینے ہیں جب سول اور نیم عسکری ہر حلقے سے یہ راگ کچھ زیادہ ہی اُونچے سُروں میں الاپا گیا۔ اللہ اللہ کر کے نومبر اپنے اختتام کو پہنچا۔

جنرل راحیل شریف بڑی عزت اور اعزاز سے اپنی دستوری مدت ملازمت پوری کر کے، کسی توسیع سے دامن بچاتے ہوئے رخصت ہوئے اور فوج کی نئی کمانڈ نے ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر کیا جائے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ملک کو ہر طرح کی آمریت اور جبر کی حکمرانی سے محفوظ رکھے۔ دستور اور اس کے قائم کردہ سب ادارے اپنے اپنے دائرے میں مؤثر خدمات انجام دیں۔ ریاستی اُمور اور قومی زندگی کو چلانے کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور نے جو سرخ لکیریں واضح طور پر کھینچ دی ہیں، ان کا سب احترام کریں۔ پھر نظم و ضبط یا چیک اینڈ بیلنس کا جو نظام دستور نے قائم کیا ہے اور جو جمہوری کلچر میں معتبر ہے، وہ مؤثر اور متحرک رہے، انحراف کی تمام مخلصانہ یا شرانگیز کوششیں ناکام و نامراد ہوں، اور یہ ملک سارے خطرات سے محفوظ رہے۔ آمین!

اس سخت اور خطرناک مرحلے سے کامیابی سے گزرنے پر، جہاں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں، اور جنرل راحیل شریف کو ان کے معیاری پیشہ ورانہ کردار اور ہر طرح کی اشتعال انگیزیوں

اور ترغیبات سے دامن بچا کر گزر جانے پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں، وہیں قوم اور اس کے تمام بہی خواہوں اور خصوصیت سے سوچنے سمجھنے والے باثر افراد کو غور وفکر کی دعوت دینا چاہتے ہیں، کہ جمہوریت کو بچانے یا جمہوریت کی بساط لپیٹنے کے باب میں اس زمانے میں جو کچھ ہوا، اس کا بے لاگ جائزہ لیں۔ خرابی جہاں بھی ہے اور خطرات جن دروازوں پر دستک دیتے رہے ہیں، ان کو شناخت کرنا اور آیندہ کے لیے پیش بندی کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے اور اس سلسلے میں غفلت بڑی مہنگی پڑسکتی ہے۔

ہم پوری دل سوزی سے بات کا آغاز اس حوالے سے کرنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے کہ پاکستان ہی کی تاریخ میں غالباً یہ منفرد واقعہ ہے کہ جس میں فوج کے ایک سربراہ کو وزیراعظم اور صدرِمملکت نے اس طرح رخصت کیا ہے کہ جیسے کسی بڑے خطرے کے ٹلنے پر وہ سُکھ کا سانس لے رہے ہوں۔

حکومتی حلقے جس انداز میں ہفتوں سے اس مہم کے مقابلے میں جوابی مہم چلائے ہوئے تھے، ملک کے دَر و دیوار پر بار بار جس قسم کی تحریریں رُونما ہورہی تھی، میڈیا کے دانش ور اور بعض جیالے جس جوش وخروش سے اور جس زبان میں اپنے اپنے خوابوں کو حقیقت کے رُوپ میں پیش کر رہے تھے اور تاریخوں تک کا ورد کرنے میں کسی بھی احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کر رہے تھے___ الحمدللہ وہ پورا منظرنامہ بدل گیا ہے۔ تاہم، خود جمہوریت کو جو خطرہ اس پورے کھیل سے اور اس کی ہرشکل اور ہر پہلو سے تھا اور آیندہ پھر کسی نئے عنوان سے سراُٹھا سکتا ہے اس پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے اور مستقبل میں اس صورتِ حال سے بچنے کی تدابیر نہ کرنا بڑا عاقبت نااندیشانہ رویہ ہوگا۔

یہ امر تسلیم کرنا ہوگا کہ حکومت اور فوج کے درمیان تناؤ یا کش مکش (tension) موجود تھی اور اس کا اظہار عجیب وغریب صورتوں میں ہوتا رہا ہے۔ فوجی ترجمانوں کے بیانات اور سوشل میڈیا پر مختصر پیغامات (tweets) کا تبادلہ یا سہارا بھی معمول کے مطابق نہیں تھا۔ پھر عسکری اور سیاسی قیادت کے درمیان مناقشے پر مبنی گمراہ کن خبر کا روزنامہ ڈان میں شائع ہونا اور اس کے بعد حکومت اور عسکری ذرائع دونوں کی طرف سے حقائق کو بے نقاب کرنے یا معاملات کو اور زیادہ گنجلک کرنے

کے سلسلے میں جو کچھ کیا گیا، وہ بڑا تکلیف دہ تھا۔ ایسی بدنما صورتِ حال سے آیندہ بچنے کی فکر ازبس ضروری ہے۔ اس سلسلے میں میڈیا کے ایک بڑے حصے کا کردار بھی بڑا پریشان کن ہے۔ ہم نے دنیا کے کسی بھی مہذب جمہوری ملک کے میڈیا پر ساری آزادی کے باوجود ایسے حساس اُمور پر اس قسم کی لاف زنی کی کوئی مثال نہیں دیکھی۔ ہم اس غیر ذمہ دارانہ رویے کو ملک میں جمہوریت کے مستقبل اور اداروں کے درمیان غلط فہمیوں کے فروغ، نیز تعاون اور توازن کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔

اس پس منظر میں سینیٹ کے چیئرمین جناب میاں رضا ربانی کا انٹرنیشنل پارلیمانی یونین کے پلیٹ فارم سے بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے بجا طور پر جمہوریت کو لاحق خطرات کی احتیاط سے نشان دہی کی ہے اور پارلیمنٹ کی بالادستی، تمام اداروں کے اپنے اپنے حدود میں کام کرنے اور احتساب کے باب میں سب کے لیے مؤثر نظام وضع کرنے اور کسی کے لیے بھی 'مقدس گائے' نہ ہونے کی بات کر کے قوم کو بڑے بنیادی مسائل کی طرف متوجہ کیا ہے۔

چیئرمین سینیٹ کی باتوں سے عمومی اتفاق کے ساتھ ہم یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ پارلیمنٹ کی بالادستی دستور کے فریم ورک کے اندر ہے اور پارلیمنٹ بھی اسی طرح دستور کی تخلیق (creature) ہے، جس طرح دوسرے تمام ادارے، خصوصیت سے انتظامیہ، عدلیہ، فوج اور آزادیِ صحافت۔

جمہوریت کو جو حقیقی خطرات آج درپیش ہیں، ان میں جہاں فوج، بیوروکریسی اور عدلیہ کا اپنے اپنے دائرے کے اندر محدود رہنا ضروری ہے، وہیں پارلیمنٹ اور پارلیمانی نظام کی پیداوار حکومت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ دستور اور جمہوری کلچر اور ان کے اصول و آداب کا پورا پورا احترام کرے۔ سیاسی جماعتوں کی تنظیم اور ان کا کردار بھی جمہوری، دستوری اور آئین کی حکمرانی کے باب میں مرکزی اہمیت رکھتے ہیں۔

فوج کی مداخلت

پاکستان کی تاریخ گواہ ہے کہ سیاسی اُمور میں فوج کی مداخلت، خواہ وہ کسی بھی عنوان سے ہوئی ہو اور اس نے کیسی ہی تائیدِ اعتبار (validation) حاصل کر لی ہو، وہ فی الحقیقت ملک کے لیے نہایت نقصان دہ ثابت ہوئی ہے۔ بات صرف ملک کی سیاست، معیشت، معاشرت

اور خارجہ تعلقات تک محدود نہیں رہی، خود ملک کی سلامتی، اس کے نظریاتی اور جمہوری تشخص اور فوج کی پیشہ ورانہ صلاحیت ہر چیز پر اس کے منفی اثرات پڑے ہیں۔ دفاعی صلاحیت بھی متاثر ہوئی ہے۔ سیاست میں فوج کی شرکت سے نہ صرف کرپشن میں اضافہ ہوا بلکہ خود فوج کا دامن جس طرح کرپشن سے پاک ہونا چاہیے، وہ بھی داغ دار ہوا ہے۔ اس سب پر مستزاد فوج کا بیرونی حکومتوں سے براہِ راست تعلق، بیرونی قوتوں کا ملک میں دراندازیوں میں خطرناک حد تک اضافے کا ذریعہ بنا ہے۔ یہ عمل جنرل محمد ایوب خان کے زمانے ہی میں شروع ہوگیا تھا، جو جنرل پرویز مشرف کے دور میں اپنی انتہا کو پہنچا۔ اللہ کا شکر ہے کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی کے زمانے میں ایک عرصے تک یہ سلسلہ جاری رہنے کے بعد، اس میں کمی آنا شروع ہوئی اور جنرل راحیل شریف کے زمانے میں نمایاں فرق پڑا۔ ہم کس مقام تک گر گئے تھے، اس کا ادراک ضروری ہے، تاکہ بگاڑ کو اس کی ہر شکل میں روکا جاسکے۔

امریکی اثرورسوخ

جنرل پرویز مشرف نے نہ صرف امریکی صدر بش اور وزیرخارجہ کولن پاول کے حکم (ستمبر ۲۰۰۱ء) پر ملک کو امریکیوں کی آماج گاہ بنایا بلکہ ملک کی آزادی و خودمختاری کو پارہ پارہ اور امن وامان کو تباہ و برباد کیا۔ اسی پر بس نہیں، بلکہ ملک کے سیاسی معاملات میں بھی امریکا کو وہ اثر ونفوذ فراہم کیا، جس کا تصور بھی دل ودماغ کو مفلوج کردیتا ہے۔ پاول کے بعد کونڈا لیزا رائس امریکا کی وزیرخارجہ اور بش کے زمانے میں کرتا دھرتا تھیں۔ موصوفہ نے اپنی خودنوشت میں جو صورتِ حال بیان کی ہے، وہ غور سے پڑھنے کی چیز ہے۔ اس کے آئینے میں اپنی سیاسی اور فوجی قیادت کی کارگزاریوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے تاکہ اس قسم کے سیاسی کھیل اور ملک کی سلامتی اور مفادات کا سودا کرنے کا دروازہ بند کیا جاسکے۔ جنرل مشرف صاحب آج دستور کی دفعہ ۶ سے بھاگتے پھر رہے ہیں اور اب بھی ٹی وی شوز پر غداری کے الزام پر غصے میں آجاتے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کونڈا لیزا رائس کی خودنوشت کے آئینے میں ان کی جو اصل شکل نظر آتی ہے، وہ بڑی عبرت ناک ہے۔ اس میں اس وقت کی پیپلز پارٹی کی چیئرپرسن بے نظیر بھٹو صاحبہ کا بھی جو کردار سامنے آتا ہے، وہ پاکستان کی آزادی اور خودمختاری کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں۔

بات جب ذاتی مفاد کی ہو تو بدقسمتی سے ہر قیادت، چاہے وہ عسکری راستے سے اقتدار میں آئی ہو یا سیاسی دروازے سے، اس کی جو شکل قوم کے سامنے ہے اس پر شرمندگی ہوتی ہے۔

۲۰۰۷ء کے شروع میں جنرل مشرف صاحب نے خود امریکیوں سے درخواست کی کہ: ''میں بےنظیر بھٹو صاحبہ سے مفاہمت چاہتا ہوں اور اس کے لیے امریکا کی معاونت چاہیے''۔ ان کی اس خواہش کے جواب میں کونڈالیزا رائس نے درمیانی کردار ادا کیا، جو بالآخر ۴/اکتوبر ۲۰۰۷ء کو باقاعدہ معاہدے پر منتج ہوا۔ اس سلسلے میں امریکی سفیر متعینہ اسلام آباد پیٹرسن نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ معاہدے کے تین بنیادی نکات تھے:

۱- جنرل پرویز مشرف اپنی وردی اُتار دیں گے۔

۲- بےنظیر صاحبہ اور ان کے شوہر کے خلاف کرپشن کے جو مقدمات ہیں، انھیں ان کی گرفت سے خلاصی اور ضمانت دی جائے گی کہ اس سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔

۳- دستوری ترمیم کی جائے گی جس کے نتیجے میں تیسری بار وزیراعظم بننے پر [۱۷ویں ترمیم کے ذریعے] جو پابندی ہے، وہ ختم کردی جائے گی۔

اس سارے بول تول اور معاملہ بندی میں امریکی صدر بش براہِ راست شریک تھے اور بےنظیر صاحبہ نے انھیں صاف کہا تھا کہ میں جنرل مشرف کے وعدے پر اعتماد نہیں کرتی، اور صرف امریکا کی ضمانت پر اس معاہدے میں شریک ہوسکتی ہیں۔ کونڈا لیزا رائس کے الفاظ:

"She didn’t trust Musharraf", adding that "I am taking this as a US guarantee that he will".

واضح رہے کہ خفیہ طور پر یہ معاہدہ اس وقت ہو رہا تھا، جب 'لندن معاہدے' کے تحت بےنظیر صاحبہ اور میاں نواز شریف صاحب نے یہ عہد کیا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی فوجی حکمرانوں سے بات چیت نہیں کرے گا۔ بلاشبہہ مشرف صاحب نے ۳ نومبر ۲۰۰۷ء کی ایمرجنسی کے ذریعے بےنظیر سے کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی اور بےنظیر صاحبہ نے بھی اس سے براءت کا اعلان کرتے ہوئے اس وقت کے معزول چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی حمایت کا اعلان کردیا۔ ڈاکٹر فرخ سلیم ۱۳ نومبر ۲۰۱۶ء کے دی نیوز میں یہ ساری تفصیل دینے کے بعد

ہماری سیاست اور اس میں امریکا کے کردار کا جو خلاصہ پیش کرتے ہیں وہ یہ ہے:

۱- امریکی پاکستان میں حکومتوں کے بننے اور ٹوٹنے میں کردار ادا کرتے ہیں۔

۲- امریکی پاکستان میں ایسی قیادت کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالتے ہیں، جسے وہ 'ماڈریٹ' تصور کرتے ہیں۔

۳- ہمارے سیاست دان ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے اور عموماً امریکا کی ضمانت چاہتے ہیں۔

۴- امریکی کرپٹ سیاست دانوں کو 'محفوظ' کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ (دی نیوز، ۱۳ نومبر ۲۰۱۶ء)

امریکا کا ہدف

واضح رہے کہ کونڈا لیزا رائس اپنی سوانح میں اپنے اس کردار کے بارے جو بات لکھتی ہیں وہ ہر پاکستانی کو اچھی طرح سمجھنی چاہیے اور جو نظریاتی جنگ آج عالمی سطح پر ہو رہی ہے اس کی نوعیت کو سمجھنا چاہیے۔ پرویز مشرف اور بے نظیر کو شراکتِ اقتدار کے اسٹیج پر لانے کے لیے امریکا کا اصل محرک کیا تھا؟ اس بارے میں کونڈا لیزا رائس کے الفاظ بہت واضح، اور قوم کے لیے چشم کشا ہیں:

> اگر دو حریف طاقت میں تعاون کا معاہدہ کرسکیں، تو اس سے سیاست کا وزن ماڈریٹ (قیادت) کی طرف منتقل ہوجائے گا اور اسلام پسندوں کے وزن کو کم کردے گا۔ جیسا کہ سابق وزیراعظم نواز شریف، جن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ پاکستانی سیاست میں دیگر نمایاں شخصیات کے مقابلے میں وہ عسکریت پسندوں سے تعلقات نبھانا چاہتے ہیں۔

مشرف صاحب نے یہی نہیں کیا بلکہ بھارت کی شرائط پر کشمیر کے مسئلے کو پانی پانی کرنے (liquidate) اور بھارتی قیادت کی وضع کردہ 'دہشت گردی' کی تعریف کو قبول کرنے کے جرم کا بھی فخریہ انداز میں ارتکاب کیا جس کے نتیجے میں اصل دہشت گردی کو تحریکِ آزادی اور حقِ خوداختیاری (right of self determination) کی اس جدوجہد کے برابر کی سطح پر لا کھڑا کیا گیا

جس بارے میں خود بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے مسئلۂ کشمیر پر ہمارے قومی موقف کو تسلیم کر رکھا ہے۔ اس پسپائی نے ہمارے قومی موقف کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔

پھر مشرف صاحب نے خود ملک کی سیاست میں ان عناصر کو گلے سے لگایا اور انھیں اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا، جو منظم عسکری قوت کو سیاست میں بے دریغ استعمال کر رہے تھے۔ وہ بھتا خوری، قتل و غارت گری، ٹارگٹ کلنگ، ناجائز قبضے اور میڈیا اور سیاسی مخالفین کو دہشت زدہ کرنا، ان عناصر کا معمول تھا۔ ان کی قیادت بھارت کی تقسیم کو تاریخی غلطی قرار دیتی تھی، اس نے بھارت کی سرزمین پر پاکستان کے قیام کی مخالفت کی، اور اس کے بارے میں تمام انٹیلی جنس ایجنسیوں بشمول آئی ایس آئی اور ایم آئی کو یقین تھا کہ بھارت اور اس کی ایجنسی 'را' ان کی مالی سرپرستی کر رہی ہے، ان کی دہشت گردی کی عسکری تربیت کا اہتمام کرتی ہے اور یہ بھارت اور برطانیہ دونوں کے آلۂ کار کے طور پر کام کر رہے ہیں۔

حال ہی میں صوبہ سندھ میں ۱۴برس تک براجمان رہنے والے گورنر عشرت العباد اور جنرل مشرف کے منظورِ نظر کراچی کے میئر نے ایک دوسرے کے خلاف جو کچھ کہا ہے، حقیقت میں دونوں کے 'ارشادات' حرف بہ حرف درست ہیں۔ البتہ سوال ان قیادتوں پر ہے، خواہ ان کا تعلق فوج کے دائرۂ اقتدار سے تھا یا سیاست دانوں کے میدانِ کار سے: یعنی پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ 'ن' اور مسلم لیگ 'ق' وغیرہ کہ جنھوں نے ان عناصر کی نازبرداری کی، انھیں سینے سے لگایا اور انھیں کھل کھیلنے کا ہر موقع فراہم کیا۔

پرویز مشرف چونکہ صدر ہی نہیں، فوج کے سربراہ بھی تھے، اس لیے ان کے دور میں جو کچھ ہوا، عوام کی نگاہ میں اس کی ذمہ داری میں فوج بہ حیثیت ادارہ بھی شریک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں خود فوج کو اپنے جوانوں کو یہ ہدایت دینا پڑی کہ وہ فوجی وردی میں سول ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے سے اجتناب کریں۔ اللہ کا شکر ہے کہ جنرل پرویز مشرف کے رخصت ہونے کے بعد یہ صورتِ حال ختم ہوئی۔ یوں فوج اور قوم کے اعتماد کا رشتہ بحال ہوا اور خصوصیت سے جنرل راحیل شریف کے دور میں فوج نے پھر وہ عزت اور اعتماد حاصل کرلیا، جو پاکستان کی قومی زندگی میں ہمیشہ اس کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم دل پر پتھر رکھ کر اور ندامت کے احساس کے ساتھ امریکی مداخلت کی ایک اور مثال ضرور قوم کے سامنے لانا چاہتے ہیں تاکہ قوم کو اندازہ ہوسکے کہ ملک کے سیاسی اور فوجی معاملات میں امریکی مداخلت اور اثراندازی کہاں تک پہنچ چکی ہے اور اسلام آباد میں امریکی سفارت خانہ جو اخباری اطلاعات کے مطابق دنیا میں سب سے بڑا امریکی سفارت خانہ ہے، کیا کیا گل کھلاتا رہتا ہے اور ہماری سیاسی قیادت کس حد تک اس کے ہاتھوں کھیلنے کے لیے تیار ہوجاتی ہے۔

بروس ریڈل جو امریکی سی آئی اے میں اعلیٰ افسر اور امریکا کے چار صدور کے مشیر بھی رہے، وہ اپنی یادداشتوں Deadly Embrace میں لکھتے ہیں:

> واشنگٹن پس پردہ اس مقصد کے لیے متحرک تھا کہ جنرل پرویز کیانی کی اُس مدتِ ملازمت میں توسیع ہو، جو ۲۰۱۰ء میں ختم ہورہی تھی، جب کہ [یوسف رضا] گیلانی کی حکومت جو بعض وجوہ سے جنرل کیانی کو برقرار رکھنا چاہتی تھی اور تین سال کی توسیع دینا چاہتی تھی۔

جمہوریت کو خطرہ سیاست میں فوج کی مداخلت ہی سے نہیں ہے بلکہ فوج اور سیاسی معاملات میں امریکا اور دوسری بیرونی قوتوں کی کارفرمائیوں سے بھی یہ خطرہ ہے۔ سیاسی قیادت بھی ان معالات میں شریکِ کار رہی ہے۔ یہ رویے جمہوریت، پاکستان کی سلامتی، آزادی، شناخت کی حفاظت، ترقی، عوام کی آرزوؤں اور عزائم کے مطابق تعمیر وتشکیل میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ ویسے تو آج جمہوریت کو ساری دنیا ہی میں خطرات سے سامنا ہے۔ یورپ اور امریکا میں شدت پسند اور بند ذہن والی دائیں بازو کی سیاسی قوتوں کے عروج اور سیاسی اُفق پر چھا جانے کے امکانات نے ان خطرات کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔ خود امریکا میں حالیہ صدارتی انتخاب (۸ نومبر ۲۰۱۶ء) کے جو نتائج سامنے آئے ہیں، وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ پاکستان میں امریکی سفیر نے، اخباری اطلاعات کے مطابق، انتخابات پر ایک تقریب میں اقبال کا سہارا لیتے ہوئے اشارتاً اعتراف کیا ہے کہ ؎

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

ہم موصوف کی خوش ذوقی، سیاسی جرأت اور سخن فہمی کی تو داد دیتے ہیں، لیکن ان کو یاد کرانے کی جسارت کرتے ہیں کہ ڈونلڈ ٹرمپ کے سلسلے میں تو امریکی جمہوریت اس (گنتی والے) معیار سے بھی دُور ہی نظر آتی ہے، کیونکہ ہیلری کلنٹن صاحبہ نے ان سے بیس لاکھ ووٹ زیادہ حاصل کیے ہیں۔ تین ریاستوں میں ووٹوں کی گنتی میں گڑبڑ کی بھی خبریں ہیں اور فنڈ ریزنگ مہم جاری ہے کہ وہاں دوبارہ گنتی کرائی جائے جسے Physical recount کہا جاتا ہے۔

سیاسی معاملات میں فوج کی کھلی یا پس پردہ مداخلت اور قومی سیاسی اُمور پر پبلک اظہارِ رائے، جمہوری روایات اور دستور کے الفاظ اور روح سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسی طرح فوج پر ناروا تنقید اور اسے سیاسی مخالفت یا سیاسی کردار پر اُبھارنا بھی دستور کی روشنی میں ایک سنگین جرم ہے، جس کا یہاں کھلے بندوں ارتکاب کیا جا رہا ہے۔ یہ سلسلہ اب مستقل بنیادوں پر ختم ہونا چاہیے۔ جمہوریت کے استحکام کے لیے یہ اولین ضرورت ہے۔

سیاسی قیادت اور غیر جمہوری رویہ

رضا ربانی صاحب نے صحیح کہا ہے کہ فیصلہ سازی کا محل پارلیمنٹ اور اسلام آباد ہے۔ راولپنڈی [یعنی جی ایچ کیو] کا کردار قومی سلامتی اور دفاع کے نقطۂ نظر سے سیاسی قیادت کو باخبر رکھنا اور پالیسی سازی میں بلارُورعایت اپنی رائے پیش کر دینا مسلّم ہے۔ لیکن اصل فیصلہ باہمی مشاورت سے اور سیکورٹی، ڈپلومیسی، ملکی مفادات، عوام کے جذبات و احساسات اور نظریاتی، اخلاقی اصولوں اور ملکی مصالح کی روشنی میں سیاسی قیادت ہی کو کرنا چاہیے، اور معروف طریقے سے دستوری اداروں کے ذریعے کرنا چاہیے۔ جنھیں ذاتی اور شخصی ترجیحات اور مفادات سے پاک ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں اگر فوجی قیادت کے لیے لازم ہے کہ وہ حدود کا احترام کرے تو سیاسی قیادت کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ فیصلہ سازی کا وہی طریقہ اختیار کرے، جو دستور نے طے کیا ہے، جس کی حدود اور آداب کو قانون اور اعلیٰ عدالت کے فیصلوں میں بھی واضح کر دیا گیا ہے، مگر بدقسمتی سے ہماری سیاسی حکومتیں ان کا احترام نہیں کرتیں۔ اس طرح وہ صرف جمہوریت ہی کو پامال کرنے کی مرتکب نہیں ہوتیں بلکہ ملک و قوم کو بھی بہترین اور مفید ترین فیصلوں سے محروم رکھتی ہیں۔ یوں اپنے شخصی رجحانات کو فیصلہ سازی پر مسلط کر کے دستور، قوم اور جمہوری کلچر سے

بے وفائی کی مرتکب ہوتی ہیں۔

بدقسمتی سے ہماری سیاسی قیادت جمہوری رویہ اختیار کرنے کے بجاے خالص آمرانہ رویہ اختیار کرنے کی بھی مجرم ہے۔ وہ جمہوریت کی جگہ 'بادشاہت' کو اپنا ماڈل سمجھتی ہے اور عملاً شاہانہ انداز ہی میں فیصلے کرتی ہے اور شاہانہ انداز ہی میں زندگی گزارتی ہے۔ ہم بڑے دُکھ سے کہتے ہیں کہ دونوں بڑی حکمران جماعتیں اور ان کی قیادتیں اس باب میں ایک ہی جیسا رویہ رکھتی ہیں۔ حزبِ اختلاف اور حکمران جماعت دونوں ہی میں ایک مختصر ٹولا ہے، جو سیاہ و سفید کا مالک بنا ہوا ہے۔

جماعت اسلامی کے سوا کوئی پارٹی ایسی نہیں ہے، جس کے اندر جمہوریت ہو۔ 'پلڈاٹ' اور 'فافن' کی رپورٹیں اس پر شاہد ہیں، لیکن اگر یہ رپورٹیں نہ بھی ہوتیں تو پوری قوم بچشمِ سر اس کا مشاہدہ کر رہی ہے۔ مسلم لیگ کی قیادت پر ایک خاندان اور اس کے چند معتمد علیہ ساتھیوں کو مکمل غلبہ حاصل ہے۔ پارٹی کی نہ حقیقی ممبرشپ ہے اور نہ پارٹی کا اپنا کوئی مشاورتی اور فیصلہ کرنے کا نظام ہے۔ عدالت اور الیکشن کمیشن کے حکم پر نمایشی انتخابات کیے گئے ہیں۔ مجلس عاملہ کا اجلاس ساڑھے تین سال کے بعد صرف انتخابات کی خانہ پُری کے لیے منعقد کیا گیا ہے۔ غضب ہے کہ پارلیمانی پارٹی کا کوئی اجلاس برسوں گزر جاتے ہیں، منعقد نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ مرکزی کابینہ کا اجلاس بھی کئی کئی مہینے منعقد نہیں ہوتا، حالاں کہ 'رولز آف بزنس' [ضوابطِ کار] کی رُو سے ہفتے میں ایک بار کابینہ کا اجلاس ہونا چاہیے۔

مَیں گواہی دیتا ہوں کہ جنرل محمد ضیاء الحق کی حکومت جو ایک فوجی حکومت تھی لیکن ایک معاہدے کے تحت 'پاکستان قومی اتحاد' جس طرح ساڑھے آٹھ مہینے حکومت میں شریک رہا، اس کی کابینہ کا اجلاس ہر ہفتے ہوتا تھا اور کئی کئی گھنٹے بلکہ پورا پورا دن جاری رہتا تھا اور ایک ایک پالیسی ایشو پوری بحث کے بعد طے ہوتا تھا۔ یہ بدقسمتی ہے کہ ۱۹۹۰ کے عشرے میں 'اسلامی جمہوری اتحاد' (آئی جے آئی) کی حکومت کے زمانے میں کابینہ کے اجلاسوں کی باقاعدگی میں خلل کا آغاز ہوگیا اور اب تو ایسا بھی ہوا ہے کہ کابینہ کا اجلاس سات یا آٹھ مہینے کے بعد منعقد ہوا ہے، اور سپریم کورٹ کو باقاعدہ اپنے فیصلے میں احتساب کرنا پڑا ہے کہ: ''وزیراعظم کابینہ کے فیصلے کے بغیر ایسے فیصلے اور اقدام کر رہے ہیں جن کے وہ مجاز نہیں''۔ حد یہ ہے کہ ٹیکس لگانے، لیوی کا اطلاق کرنے اور

ٹیکس سے چھوٹ دینے تک کا کام جو کابینہ کے فیصلے کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا، وہ بھی بے دریغ انداز میں کیا جارہا ہے۔ دسیوں وزیر ایسے ہیں کہ جو وزیراعظم کا چہرہ مہینوں تک نہیں دیکھ پاتے۔

اسی طرح قومی اسمبلی اور سینیٹ کا بھی یہ حال ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے اور قومی معاملات کے سلسلے میں فیصلوں پر اثراندازی سے مکمل طور پر محروم ہیں۔ حکمران پارٹی کے ارکان تک کسی شمار قطار میں نہیں۔ ان کی سعادت بس یہ ہے کہ اگر وزیراعظم صاحب اسمبلی میں آئیں، جو وہ شاذونادر ہی آتے ہیں کہ گذشتہ ساڑھے تین سال میں وہ صرف ۱۹ فی صدی اجلاس میں شریک ہوئے ہیں، تو اس وقت ممبر لائن لگا کر اپنے کام درخواستوں کی شکل میں پیش کرتے ہیں ___ یہ ایک ایسی بدنما مثال ہے جس کی کوئی نظیر جمہوری ملک کی پارلیمنٹوں میں دُور دُور تک نہیں ملتی۔

اسی طرح جو دستوری ادارے ہیں، یعنی: کونسل آف کامن انٹرسٹ، نیشنل اکانومک کونسل، این ایف سی ایوارڈ کمیٹی، پارلیمانی کمیٹی براے دفاع و قومی سلامتی، ان کے اجلاس مہینوں تک نہیں ہوتے، جس کے نتیجے میں تمام دوسرے متعلقہ ادارے بروقت مشاورت میں شرکت سے محروم رہتے ہیں۔ اگر چار و ناچار اجلاس ہوتے بھی ہیں تو نہایت عجلت میں، مناسب ایجنڈے اور ورکنگ پیپرز کے بغیر، بس رواروی میں معاملات کو نمٹانے کے لیے۔ اصل فیصلہ وزیراعظم خود یا ان کے چند چہیتے وزیر اور مشیر کرتے ہیں۔ یہ رویہ جمہوریت کی ضد اور اس کے فروغ کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جمہوریت کو خطرہ صرف طاقت کے دوسرے ماخذ ہی سے نہیں، سیاسی قیادت کے مجرمانہ رویے کے نتیجے میں طاقت کے اس ارتکاز سے بھی ہے۔ جب تک یہ درست نہ ہو جمہوریت پروان نہیں چڑھ سکتی۔

ہم دُکھ سے عرض کرتے ہیں کہ پارلیمان بھی اپنا کردار ادا نہیں کر رہی۔ نصف کے قریب ارکان وہ ہیں، جنھوں نے کبھی تقریر کرنے یا بحث میں حصہ لینے کی زحمت ہی نہیں کی۔ ایک بڑی تعداد بشمول بہت سی پارٹیوں کے سربراہ، وہ کلیدی ارکان ہیں جن کی اجلاسوں میں شرکت ۱۰ فی صد سے بھی کم ہے۔ اسمبلی میں جن ۱۵/ارکان کی کارکردگی سب سے بہتر ہے، ان میں حکومتی پارٹی کا صرف ایک رکن ہے۔ الحمدللہ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کے ارکان کا کردار مثالی ہے۔ سب سے بہتر کارکردگی کا اعزاز جمعیت علماے اسلام کی خاتون رکن نعیمہ کشور کا ہے،

جن کا اسکور ۷۰ فی صد رہا ہے۔ جماعت اسلامی کے چاروں ارکانِ اسمبلی اوّلین ۱۰؍ارکان میں شامل ہیں اور اس طرح جماعت اسلامی کا اسکور ۱۰۰ فی صد رہا ہے، جب کہ اسمبلی میں کارکردگی کے حوالے سے سب سے کم شرکت کا سہرا فریال تالپور صاحبہ کا ہے، جو زرداری صاحب کی بہن اور پیپلز پارٹی کی بڑی حد تک کرتا دھرتا ہیں۔ بدقسمتی سے کم ترین کارکردگی دکھانے والوں میں محترم عمران خان صاحب، مسلم لیگ ن کے 'گلِ سرسبد' حمزہ شہباز شریف بھی شامل ہیں، ان کا اسکور ۲۰ فی صد سے بھی کم ہے۔ جماعت اسلامی کو اعلیٰ کارکردگی کا یہ اعزاز پہلی مرتبہ حاصل نہیں ہو رہا۔ ۱۹۷۲ء کی اسمبلی میں پروفیسر عبدالغفور احمد کو یہ اعزاز حاصل تھا۔ ۱۹۸۵ء کی اسمبلی میں لیاقت بلوچ سرفہرست تھے۔ سینیٹ کے ۲۱ برسوں میں الحمدللہ، راقم الحروف کی اوّل پوزیشن رہی۔ آج بھی سینیٹ کے ۱۰ مؤثر ترین ارکان میں امیر جماعت برادرم سراج الحق اپنی تمام دوسری ذمہ داریوں کے باوجود شامل ہیں۔

اگر پارلیمنٹ اور ارکانِ پارلیمنٹ اپنی ذمہ داری ادا نہیں کریں گے، تو پارلیمنٹ کی بالادستی کے بارے میں کتنے ہی خوش کُن دعوے آپ کیوں نہ کرڈالیں، پارلیمنٹ بالادست نہیں ہوسکتی۔ آج پارلیمنٹ ایک نمایشی ادارہ بنادی گئی ہے۔ ہرسال دسیوں بار کورم پورا نہ ہونے کی وجہ سے اجلاس برخاست کرنا پڑتے ہیں۔ سوالات کرنے والے کم ہیں اور جو سوال کیے جاتے ہیں، ان میں تین چوتھائی جواب سے محروم رہتے ہیں۔ آدھی قانون سازی آرڈی ننس کے ذریعے کی جاتی ہے اور انتظار کیا جاتا ہے کہ اسمبلی برخاست ہو اور آرڈی ننس نازل کر دیا جائے۔ کمیٹیاں کچھ ہی متحرک ہیں، تاہم سینیٹ کی کمیٹیاں زیادہ مؤثر کردار ادا کر رہی ہیں۔ چودھری نثار علی خاں کے دورِ صدارت میں قومی اسمبلی کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی نے اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کیا، لیکن موجودہ دور میں گو کہ قائد حزبِ اختلاف اس کے سربراہ ہیں، اس کی کارکردگی اطمینان بخش نہیں ہے۔ سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت کے اکاؤنٹس کا احتساب اس کمیٹی کا ایجنڈا ہے، جس کے سربراہ پیپلز پارٹی کے نمایندہ ہیں ؎

گر ہمیں مکتب و ہمیں ملا
کار طفلاں تمام خواہد شد

عدلیہ کے کردار کو محدود کرنے کی کوشش

سپریم کورٹ کے محترم چیف جسٹس ظہیر جمالی صاحب اور دوسرے جج حضرات نے گذشتہ دو مہینوں میں چار مرتبہ حکومت کو متنبہ کیا ہے کہ وہ بدترین حکمرانی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ 'اچھی حکمرانی' کا فقدان ہے۔ ذاتی پسند و ناپسند رہنما اصول بن گئے ہیں اور بادشاہت کے انداز میں کارِحکمرانی انجام دیے جا رہے ہیں۔ احتساب کا دُور دُور پتا نہیں، تقرریاں میرٹ سے محروم ہیں۔ اعلیٰ عہدے خالی پڑے ہوئے ہیں۔ بہت سے اہم محکمے قائم مقام سربراہوں کی نگرانی میں چل رہے ہیں اور وہاں بھی بالعموم مطلوبہ گریڈ سے ایک گریڈ کم کے افسر کو لگایا گیا ہے تاکہ وہ حکمرانوں کے اشارۂ چشم و ابرو پر کام کرے اور اختلاف کی جرأت نہ کرسکے۔ جو افسر اصول اور قواعد کا احترام کرتا ہے، وہ نظروں سے گرتا ہے اور انتقامی کارروائی کا مستحق بن جاتا ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک شعبے کا نہیں، اہم ترین شعبوں کا بھی یہی حال ہے۔

وزیراعظم صاحب کے اہلِ خانہ (جن کی کوئی نمایندہ حیثیت نہیں اور جنھوں نے 'رازداری' کا حلف بھی نہیں لیا ہے) سرکاری معاملات میں دخیل اور پالیسی بنانے، نافذ کرنے یا نگرانی کرنے پر مامور ہیں۔ سرکاری تقاریب میں شریک ہوتے ہیں۔ جن محفلوں اور اجتماعات میں 'رازداری' اصل الاصول ہے، ان میں شرکت کرتے ہیں اور اخباری اطلاعات کے مطابق اپنی مرضی سے جو معلومات آشکارا (leak) کرنا چاہتے ہیں، بے دھڑک کرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ اندازِ حکمرانی جمہوریت کے لیے سمِ قاتل ہے اور اقتدار میں نواز شریف ہوں یا بےنظیر صاحبہ یا زرداری صاحب، سب جمہوریت کے اس قتل میں شریک ہیں۔ جمہوریت کو آج اصل خطرہ اسی طرزِ حکمرانی سے ہے۔ اور جب تک اس کی اصلاح نہیں ہوتی، جمہوریت ایک خواب رہے گی، حقیقت نہیں بن سکتی۔ چیف جسٹس صاحب نے اورنج ٹرین کے مقدمے کی سماعت کے دوران بڑے دُکھ سے جو بات کہی ہے، وہ نوشتۂ دیوار اور پاکستان کے ہر مخلص بہی خواہ کے دل کی آواز ہے۔ ان کا ارشاد ہے:

> جمہوریت کے نام پر بادشاہت اور اچھی طرزِ حکمرانی پر بُری حکمرانی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ پاکستان کے عوام اس کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں .... عوام کو چاہیے کہ

ووٹ دیتے وقت دُور اندیشی سے ان معاملات پر نظر رکھیں۔

چیف جسٹس کے ان ریمارکس پر حکومت کے ترجمان اور کاسہ لیس بڑے سیخ پا ہوئے ہیں اور عدالت کے رویے کو جمہوریت کے لیے 'خطرہ' بنا کر پیش کر رہے ہیں، لیکن دستور کی دفعہ ۱۸۴ (ج) اور دفعہ ۱۸۷، اعلیٰ عدالت کی یہ ذمہ داری مقرر کرتی ہیں کہ مفادِ عامہ، بنیادی حقوق کی حفاظت اور انصاف کی فراہمی کے لیے اپنے غیرمحدود اختیارات کو استعمال کرے اور اصلاحِ احوال کے لیے ضروری احکام جاری کرے۔ دستور نے نظم وضبط کا یہ نظام قائم کیا ہے اور جمہوریت کے قیام اور استحکام کے لیے اس کی کلیدی اہمیت ہے اور یہ حکومت کو اُن مواقع پر لگام دینے کے لیے ضروری ہے جب وہ جمہوری اصولوں اور دستور کے الفاظ اور روح سے انحراف کرتے ہوئے بادشاہت، آمریت یا جمہوری اقدار کی پامالی کی راہ پر گامزن ہو:

دفعہ ۱۸۷: ۱- عدالتِ عظمیٰ کو بہ اخراج ہر دیگر عدالت کے، کسی دو یا دو سے زیادہ حکومتوں کے درمیان کسی تنازع کے سلسلے میں ابتدائی اختیارِ سماعت حاصل ہوگا۔

تشریح: اس شق میں 'حکومتوں' سے وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتیں مراد ہیں۔

۲- شق (۱) کی رُو سے تفویض کردہ اختیارِ سماعت کے استعمال میں عدالتِ عظمیٰ صرف استقراری فیصلے صادر کرے گی۔

۳- آرٹیکل ۱۹۹ کے احکام پر اثرانداز ہوئے بغیر، عدالتِ عظمیٰ کو، اگر وہ یہ سمجھے کہ حصہ دوم کے باب ۱ کے ذریعے تفویض شدہ بنیادی حقوق میں سے کسی حق کے نفاذ کے سلسلے میں عوامی اہمیت کا کوئی سوال درپیش ہے، تو مذکورہ آرٹیکل میں بیان کردہ نوعیت کا کوئی حکم صادر کرنے کا اسے اختیار ہوگا۔

اسی طرح دفعہ ۱۸۷ بہت واضح ہے:

دفعہ ۱۸۷: (۱) (آرٹیکل ۱۷۵ کی شق (۲) کے تابع) عدالت عظمیٰ کو اختیار ہوگا کہ وہ ایسی ہدایات، احکام یا ڈگریاں جاری کرے، جو کسی ایسے مقدمے یا معاملے میں جو اس کے سامنے زیرِسماعت ہو، مکمل انصاف کرنے کے لیے ضروری ہوں، ان میں کوئی ایسا حکم بھی شامل ہے، جو کسی شخص کے حاضر کیے جانے، یا کسی دستاویز کو

برآمد کرنے یا پیش کرنے کے لیے صادر کیا جائے۔

(۲) ایسی کوئی ہدایت، حکم یا ڈگری پاکستان بھر میں قابلِ نفاذ ہوگی اور جب اس کی تعمیل کسی صوبے میں، یا کسی ایسے قطعے یا علاقے میں کی جانی ہو، جو کسی صوبے کا حصہ نہ ہو، لیکن اس صوبے کی عدالت عالیہ کے دائرۂ اختیار میں شامل ہو، تو اس کی اسی طرح سے تعمیل کی جائے گی گویا کہ اسے اس صوبے کی عدالتِ عالیہ نے جاری کیا ہو۔

دونوں دفعات بہت واضح ہیں اور عدالتِ عالیہ کو صرف یہ اختیار ہی نہیں دیتیں، بلکہ اس پر یہ لازم کرتی ہیں کہ وہ حقوق کی حفاظت اور عدل کی فراہمی کے سلسلے میں ہر حکومت اور حکومت کے ہر فرد اور ہر حکم، خواہ اس کا تعلق ان میں سے کسی بھی ادارے سے ہو، یعنی سیاسی قیادت، انتظامیہ، میڈیا، عسکری حکام اپنی ذمہ داری ادا کرے۔ عدالت: دستور، قوم اور اللہ تعالیٰ سب کے سامنے جواب دہ ہے۔ وہ یہ حلف لیتی ہے کہ خدا کو حاضروناظر جان کر اسلامی نظام کے قیام اور دستور اور قانون کے مکمل نفاذ کے لیے ہر مفاد سے بالا ہوکر اپنی ذمہ داری ادا کرے گی۔

موجودہ وفاقی حکومت، اعلیٰ عدلیہ کے اس دستوری کردار سے اتنی خائف ہے کہ اس نے رات کی تاریکی میں ۲۴ویں دستوری ترمیم لانے کی کوشش کی، کہ دفعہ ۱۸۴ (ج) کے تحت عدالتی احکام پر نظرثانی کی کارروائی کا اسے اختیار دیا جائے۔ یہ جمہوریت اور عدل کے نظام کو کمزور کرنے اور انصاف کے تقاضوں کے نفاذ میں تاخیری حربے استعمال کرنے کے مترادف ہے اور پارلیمنٹ، عوام اور تمام سیاسی اور دینی قوتوں کو اس ترمیم کا راستہ روکنا چاہیے۔

آمرانہ طرزِ حکومت کا خاتمہ

اس موقعے پر ایک قومی امانت کو قوم تک پہنچانے کے جذبے سے میں اپنا ایک واقعہ ضبطِ تحریر میں لارہا ہوں جو وزیراعظم محمد نواز شریف کے ذہن اور اندازِ حکمرانی کو سمجھنے میں مددگار اور ان کے رفقائے کار کی اپنی ذمہ داری بہ حُسن وخوبی انجام نہ دینے کی مثال ہے:

یہ بات ہے ۱۹۹۰ء کی آئی جے آئی کے زمانۂ حکومت کی۔ہم نے وزارت میں شرکت نہیں کی تھی، لیکن پارلیمنٹ میں پارٹی آئی جے آئی کی تھی، جس میں مسلم لیگ اور جماعت اسلامی

اہم شریکِ کار تھیں۔ اقتدار میں آنے کے چند ہی مہینے بعد، نواز شریف صاحب نے بارھویں دستوری ترمیم ۱۹۹۱ء کا سلسلہ شروع کیا۔ اصل مسودے کے دو اہم حصے تھے: ایک یہ کہ نفرت انگیز اور وحشیانہ جرائم کے لیے اپیل کورٹس مقرر کی جائیں، اور دوسرے یہ کہ وزیراعظم کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے صواب دیدی اختیارات کے تحت، دستور کی جس شق کو چاہے وقتی طور پر معطل کر سکے اور معطلی کی مدت کے تعین کا اختیار بھی وزیراعظم ہی کو حاصل ہو۔ جب یہ مسوّدہ ہمارے سامنے آیا تو قاضی حسین احمد مرحوم اور میں نے اس کی بھرپور مخالفت کی، جو نواز شریف صاحب کے لیے بڑی ناگوار تھی۔ ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ حق نہ ہم اپنے لیے لینا پسند کریں گے، نہ آپ کے لیے اور نہ کسی اور کے لیے، بشمول صدرِ مملکت۔ پھر صدر غلام اسحاق خان صاحب نے بھی اس کی سخت مخالفت کی اور میاں صاحب کو دستوری ترمیم کا یہ حصہ مسوّدے سے خارج کرنا پڑ گیا۔ نواز شریف صاحب سے ہماری گفتگو کے دوران مسلم لیگ کے کئی وزرا بھی شریک تھے، جو پوری میٹنگ میں تو مکمل طور پر خاموش رہے لیکن میٹنگ ختم ہونے کے بعد ان میں سے تین نے، یعنی: جنرل مجید ملک، وسیم سجاد اور حامد ناصر چٹھہ نے مجھ سے فرداً فرداً اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ ان میں سے دو نے یہ تک کہا کہ ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ حضرات نے اس ترمیم کا راستہ رکوا دیا، ورنہ ہم اس پر مضطرب تھے مگر کابینہ میں ہم اسے نہ روک سکے۔ جنرل مجید ملک صاحب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں، لیکن باقی دونوں حضرات الحمدللہ بقید حیات ہیں اور میری اس بات کی تائید کریں گے۔

دراصل یہ نواز شریف صاحب کا مزاج اور ذہن ہے۔ انھوں نے ایک بار پھر ۱۵ویں دستوری ترمیم کے ذریعے ایسے ہی اختیارات حاصل کرنے اور اسلام کے نام پر کُلی اختیارات کے حصول کی کوشش کی، جو کامیاب نہ ہوسکی۔

ہم دراصل اس نکتے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ جمہوریت کو جہاں بہت سے بیرونی اور اندرونی خطرات لاحق ہیں، وہاں خود جمہوریت کا نام لینے والوں، اس کی دہائی دینے والوں اور اس کے نام پر حکمرانی کرنے والوں کے اپنے ذہن اور رویے بھی خطرات کو دعوت دینے کا باعث ہیں۔

ملک میں جمہوریت کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے ہر کسی کو دستور، قانون اور اداروں کی مشاورت کا پابند کرنا ہوگا اور چیک اینڈ بیلنس کا ایسا نظام وضع کرنا، اور پھر اس پر عمل بھی کرنا ہوگا کہ سب اپنی اپنی حدود میں رہیں اور کوئی بھی ایسے اختیارات حاصل نہ کر پائے جو اسے مشاورت اور اداراتی ڈسپلن سے آزاد کردے۔ فوج اور عدلیہ کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی حدودِ کار میں رہیں اور میڈیا بھی۔ اجتماعی اُمور اور دستور میں دیے ہوئے حقوق کی پاس داری اور دوسروں کے حقوق پر دست درازی سے اجتناب بھی اشد ضروری ہے۔ اسی طرح پارلیمنٹ، حکومت اور وزیراعظم اور وزرا کے لیے بھی مشاورت کا التزام اور اس کا احترام اور دستور، قانون اور ضابطۂ کار کی پابندی لازم ہے۔ انتظامیہ، حکمرانوں کی ملازم نہیں ریاست کی ملازم ہے۔ پولیس ہو یا سول انتظامیہ، اس کے لیے قانون اور ضوابط کا پابند ہونا ضروری ہے اور حکومتِ وقت کے اشارۂ چشم و ابرو پر اور ان کے ملازم کی حیثیت سے کردار کی ادایگی نہ صرف عزتِ نفس کے خلاف ہے بلکہ دستور اور قانون کی حکمرانی کی بھی ضد ہے۔

اخبارات میں پنجاب کے ایک چیف سیکرٹری کی تابع داری کا ایک واقعہ شائع ہوا ہے، جو سب کے لیے شرم کا باعث ہے۔ ہوا یہ کہ وزیراعلیٰ کے ہاتھ سے کوئی چیز چھوٹ کر زمین پر گرگئی، تو قبل اس کے کہ وہ افراد جو ان کی خدمت پر مامور ہیں، آگے بڑھیں، چیف سیکرٹری صاحب نے جست لگائی اور وہ چیز اُٹھا کر وزیراعلیٰ کی خدمت میں پیش کر دی۔

انتظامیہ ہو یا پولیس، ایک بڑی تعداد حکمرانوں کی ذاتی پسند و ناپسند کے چکّر میں رہتی ہے اور اس کو اپنی ترقی اور اپنے مفادات کے حصول کے لیے زینہ بناتی ہے___ یہ رویہ جمہوریت، قانون کی حکمرانی، عدل و انصاف کے قیام اور عوام کی فلاح و بہبود کی راہ میں سنگین رکاوٹ ہے۔ جمہوریت کو خطرہ اس رویے سے ہے اور جب تک یہ طرزِ فکر اور طرزِ عمل نہ بدلے گا، جمہوریت کا مستقبل تاریک رہے گا۔ الحمدللہ، ایسے لوگ بھی موجود ہیں، جو اصول اور ضابطے کا احترام کرتے ہیں اور جان پر کھیل کر ان کی پاس داری کرتے ہیں، لیکن افسوس ناک حقیقت یہ بھی ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے، وہ اُٹھ رہے ہیں یا ریٹائر ہورہے ہیں۔ ان کی جگہ لینے والوں کی تعداد بہت کم ہے۔

اس زمانے میں عدالتِ عظمیٰ نے دو بڑے اہم فیصلے کیے ہیں، جو آرڈر کی شکل میں جاری ہوچکے ہیں۔ ان کا پیغام یہ ہے کہ وزیراعظم کو اپنی صواب دید (discretion) میں حکمرانی کا کوئی اختیار نہیں، بجز ان چیزوں کے جو دستور نے ان کو متعین طور پر بطور اختیار دی ہیں۔ وزیراعظم کابینہ کے ذریعے فیصلے کرنے کا پابند ہے اور دستور کی دفعہ ۹۰ اور ۹۱ وفاقی حکومت کی صاف لفظوں میں تعریف دے رہی ہیں۔ اصل اختیار کابینہ کا ہے جس کا سربراہ وزیراعظم ہے۔ برطانوی قانون کے مطابق کابینہ کے تمام ارکان بشمول وزیراعظم برابر ہیں۔ صرف انتظامی وجوہ سے وزیراعظم کو اوّلیت حاصل ہے لیکن فیصلے اجتماعی ہونے چاہییں۔ ملاحظہ کیجیے، دستور کی متعلقہ دفعات:

دفعہ ۹۰: (۱) دستور کے مطابق، وفاقی حکومت کی جانب سے وفاق کا عاملانہ اختیار صدر کے نام سے استعمال کیا جائے گا، جو وزیراعظم اور وفاقی وزرا پر مشتمل ہوگا، جو وزیراعظم کے ذریعے کام کریں گے۔

(۲) دستور کے تحت اپنے کارہائے منصبی کو وزیراعظم، خواہ بلاواسطہ یا وفاقی وزرا کے ذریعے بجالائے گا۔

دفعہ ۹۱: (۱) صدر کو اس کے کارہائے منصبی کی انجام دہی میں مدد اور مشورہ دینے کے لیے وزرا کی ایک کابینہ ہوگی، جس کا سربراہ وزیراعظم ہوگا۔

سپریم کورٹ نے اسی دستوری تقاضے کو پورا کرنے کے لیے واضح کر دیا ہے کہ وزیراعظم کے لیے لازمی ہے کہ وہ کابینہ کے فیصلوں کے ذریعے کام کریں اور تمام قانون سازی بھی اسی طریقے سے ہونی چاہیے۔

عدالتِ عظمیٰ کے ان فیصلوں کے علاوہ سندھ ہائی کورٹ نے بھی ایک بڑا اہم فیصلہ صادر کیا ہے کہ: صوبائی وزیراعلیٰ کے لیے جہاں یہ ضروری ہے کہ وہ کابینہ کے ذریعے کام کرے، وہیں دستور انھیں ایسے مشیر (adviser) بنانے کا اختیار نہیں دیتا، جو وزیر کے درجے پر کام اور فیصلے کرسکیں۔

یہ بھی بڑا اہم فیصلہ ہے، اس لیے کہ وفاقی حکومت کے سلسلے میں دستور کی دفعہ ۹۳ وزیراعظم کے مشورے پر صدر پانچ مشیر مقرر کرسکتا ہے، جن کا مرتبہ وزیر کے برابر ہوتا ہے لیکن صوبے کے لیے دستور میں ایسی کوئی گنجایش نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہرصوبے میں مشیروں اور

خصوصی معاونین کی فوج ظفر موج مقرر ہے، جو بالکل وزرا کی طرح اختیارات استعمال کر رہی ہے اور مراعات لے رہی ہے حالاں کہ ان سے 'رازداری' تک کا حلف نہیں لیا جاتا۔ یہ دستور اور جمہوریت کے ساتھ مذاق اور اپنوں کو نوازنے کا ذریعہ تھا۔ ہمیں توقع ہے کہ سپریم کورٹ، سندھ ہائی کورٹ کے اس فیصلے کی توثیق کرے گی اور اس کا اطلاق تمام صوبوں پر ہوگا۔ یوں دستور کی خلاف ورزی اور اقربا پروری اور احباب نوازی کا یہ دروازہ بند ہوگا۔

کابینہ اور مشاورت کے تمام اداروں کے بارے میں ہم یہ بات بھی واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہرسطح پر مشاورت کے معنی یہ ہیں کہ مشورے کے نتیجے میں جو فیصلہ کیا جائے گا، اس پر عمل بھی ہوگا۔ وزیراعظم اور وزیراعلیٰ کو مشاورت کے سربراہ کی حیثیت سے شوریٰ کے فیصلے کو ویٹو کرنے کا اختیار نہیں ہوگا۔ اسلامی فکر کے ماہرین میں بھی اگرچہ ماضی میں اس سلسلے میں ایک سے زیادہ آرا رہی ہیں، اور کچھ علما کی نگاہ میں شوریٰ کا فیصلہ لازم اور غالب حیثیت رکھتا ہے۔ تاہم، کچھ علما کی نگاہ میں یہ صرف مشورہ ہوتا ہے، جس کے قبول یا رد کرنے کا اختیار امیر یا صدر کو حاصل ہے، لیکن اب اُمت کے اہلِ علم کا اس پر تقریباً اجماع ہے کہ شوریٰ کا فیصلہ ہی اصل فیصلہ ہوتا ہے، محض مشورہ نہیں ہوتا کہ جسے امیر یا صدر ویٹو کر سکے۔ یہ شورائیت اور جمہوریت کی روح کے عین مطابق ہے۔

قیادت اور وراثت کا کھیل

سیاسی جماعتوں میں جمہوریت پر کاری ضرب لگانے والی ایک اور روایت، پارٹیوں میں اور خود حکومتوں میں ایک خاندان کا غلبہ اور قیادت کا وراثت کے طور پر منتقل ہونا ہے۔ وراثت کے ذریعے اقتدار دراصل بادشاہت کی علامت ہے، جب کہ جمہوریت کی روح سے یہ متصادم اور اس کے اصولوں کی ضد ہے۔ بلاشبہہ بےنظیر صاحبہ نے اپنی ذہانت، قابلیت اور صلاحیت سے اپنی قیادت کا لوہا منوایا، لیکن جناب ذوالفقار علی بھٹو کا اپنی اہلیہ کو صدر مقرر کرنا اور پھر بےنظیر صاحبہ کا شریکِ صدر ہوتے ہوئے اپنی والدہ کو قیادت سے محروم کرنا۔ پھر ان کے بعد زرداری صاحب کا شوہر ہونے کے ناتے ایک مشتبہ وصیت کی بنیاد پر اقتدار سنبھالنا، اور پارٹی کا اس کے آگے سرِتسلیم خم کر دینا، ایک عجیب اور بُری مثال ہے (بےنظیر صاحبہ نے اپنے

دورِ اقتدار میں زرداری صاحب کو تلخ تجربات اور ان کی مجروح شہرت کی وجہ سے حکومت سے دُور رکھنے کی براہِ راست کوشش کی)۔ اسی طرح یہ بھی طرفہ تماشا ہے کہ بے نظیر صاحبہ کے انتقال کے بعد ان کے زیرِتعلیم صاحب زادے پارٹی کے چیئرمین بن گئے اور مرحومہ کے شوہر شریک چیئرمین کی کرسیِ صدارت پر متمکن ہوگئے۔ پھر ایوانِ صدر بھی ان کے تصرف میں آ گیا اور صدر صاحب کی ہمشیرہ صاحبہ ڈرائیونگ سیٹ پر تشریف فرما ہوگئیں۔

یہی معاملہ مسلم لیگ 'ن' اور اس کی تمام ہم جولی لیگوں کا ہے۔ نیز وہ سب جماعتیں بھی، جن کو لبرل، آزاد خیال، بائیں بازو کی (Leflist) اور نہ معلوم کیا کیا ہونے کا دعویٰ ہے، وراثت کے اس دھندے سے پاک نہیں ہیں۔ کچھ دینی جماعتوں میں بھی بدقسمتی سے وراثت ہی کا سکّہ رائج ہے۔ ان میں واحد استثنا جماعت اسلامی پاکستان ہے، جس نے قیادت، تنظیم، فیصلہ سازی، اندرونی نظامِ احتساب، ہر پہلو سے حقیقی اسلامی جمہوری آداب کا پورا پورا احترام کیا ہے اور جس میں الحمدللہ جمہوریت اپنے آداب اور اپنی روح کے مطابق جاری و ساری ہے۔

اہلِ قیادت کی ضرورت

اسی طرح معاملہ صلاحیت، دیانت، فنی مہارت کی ضرورت و اہمیت کا ہے۔ جمہوری نظام میں سیاسی قیادت کا ہرفن مولا ہونا ضروری نہیں، لیکن اہلیت اور دیانت دو لازمی صفات ہیں، جن کے بغیر قیادت مؤثر نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے اہلیت کو ذمہ داری کے مناصب کے لیے اوّلین اہمیت دی ہے اور حکم دیا ہے کہ اپنی امانتیں اہل لوگوں کے سپرد کرو (اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ - النساء ۴:۵۸)، اور اہلیت کے باب میں بھی صاف اشارہ کر دیا ہے کہ اس میں علم اور جسم، یعنی فکری صلاحیت اور کام کی مناسبت سے جسمانی قوت اور مہارت ضروری ہیں (اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۭ - البقرہ ۲:۲۴۷)۔

بدقسمتی سے ہماری سیاسی جماعتوں میں جماعتی اور سرکاری ذمہ داریوں کے باب میں فیصلے ذاتی تعلق، شخصی وفاداری اور مفادات کے اشتراک کی بنیاد پر ہوتے ہیں اور بالعموم کسی معروضی معیار کا احترام نہیں کیا جاتا۔ 'اندھا بانٹے ریوڑیاں، ہر پھر اپنوں ہی اپنوں کو دے' پر عمل ہوتا ہے۔ احتساب کے ادارے غیرمؤثر اور مذاق بن گئے ہیں۔ کرپشن کا دور دورہ ہے اور یہی

وجہ ہے کہ قومی وسائل ایک مخصوص طبقے (اشرافیہ) کے ہاتھوں کا میل بن گئے ہیں اور عوام بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ ستم یہ ہے کہ مشہور عالمی ادارے ’انٹرنیشنل فوڈ پالیسی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ‘ کی تازہ ترین رپورٹ جو Global Hunger Index کے عنوان سے ۱۲/اکتوبر ۲۰۱۶ء کو شائع ہوئی ہے، اس کی رُو سے دنیا کے ۱۱۸ ترقی پذیر ملکوں میں پاکستان پست ترین ۱۱ ملکوں میں سے ایک ہے، یعنی نیچے سے ہمارا نمبر ۱۱ ہے۔ پاکستان کی آبادی کا ۲۲ فی صد، یعنی تقریباً ساڑھے چار کروڑ افراد خوراک کی کم سے کم مقدار سے بھی محروم ہیں اور پاکستانی بچوں کا ۴۵ فی صد فطری ترقی کی رفتار سے محروم ہے۔ گویا چار سال کے بچے کی نشوونما کی وہ کیفیت ہے جو دو سے تین سال کے بچے کی ہوتی ہے۔

معاملہ وسائل کی کمی کا نہیں ہے، ان کی غیرمنصفانہ تقسیم، بے دریغ استحصال اور غلط استعمال کا ہے۔ اس کی ایک تازہ ترین مثال عدالتِ عظمٰی کے زیرغور اس مقدمے میں سامنے آئی ہے۔ ضلع مظفرگڑھ کے ایک مخیر زمین دار نے اپنی ہزاروں ایکڑ زمین تعلیم اور فلاحی کاموں کے لیے وقف کی تھی مگر اس پر بااثر افراد نے ناجائز قبضہ کرلیا ہے اور اس کے بڑے حصے کو کوڑیوں کے مول اور سرکاری افسران نے اپنے اور اپنے مصاحبین کے مفاد میں پٹے (لیز) پر دے دیا ہے۔ ان اربوں روپوں مالیت کی زمین ایک مخیر فرد نے عوام کے بچوں کی تعلیم، صحت اور دوسری ضرورتوں کے لیے وقف کی تھی۔

سپریم کورٹ کے جج جسٹس شیخ عظمت سعید صاحب نے اس مقدمے کے سلسلے میں پنجاب کے محکمہ اوقاف کی نااہلی اور بددیانتی پر نہ صرف سخت گرفت کی ہے، بلکہ یہاں تک کہہ دیا ہے کہ: ’’پنجاب حکومت اس قابل ہی نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے‘‘ اور یہ کہ ’’کروڑوں روپے خردبرد کر لیے گئے لیکن نیب کو کیس نہیں بھیجا گیا۔ پنجاب حکومت زمین نہیں سنبھال سکتی تو اس کو سنبھالنے کا ٹھیکا کسی اور کے سپرد کردے۔ کچھ شرم و حیا بھی ہونی چاہیے۔ لگتا ہے کہ مظفرگڑھ میں ریاست کی رٹ بہت ہی کمزور ہے، اس لیے وہاں کی انتظامیہ ناجائز قابضین کے سامنے اتنی بےبس ہے‘‘۔ (روزنامہ جنگ ۲۵ نومبر ۲۰۱۶ء)

یہ اس صوبے کا حال ہے جس کے وزیراعلیٰ صاحب اپنے کو ’خادمِ اعلیٰ‘ کہلوانا پسند

کرتے ہیں اور شب وروز سرگرم نظر آتے ہیں۔ یہ صورتِ حال صرف صوبہ پنجاب کے ساتھ خاص نہیں ہے، سب ہی صوبوں کا اور خود مرکز کا حال بھی یہی ہے۔عوام مصائب کا شکار ہیں اور حکمران اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ ایک لاوا ہے جو زیرزمین پک رہا ہے اور وقتاً فوقتاً یہ لاوا پھٹ کر فضا کو مکدر کر رہا ہے۔ جمہوریت کو ایک حقیقی خطرہ اس زمینی اور زیرزمین صورتِ حال سے ہے۔ امریکا کے حالیہ صدارتی انتخاب کے بے شمار پہلو ہیں لیکن محروم طبقات میں انتہاپسندی اور انتقام کی آگ کو بھڑکانے میں ایسے ہی حالات کا بھی بڑا دخل ہے۔ جمہوریت کے لیے خطرے کی اس جہت سے نظریں چُرانا بڑے خسارے کا سودا ہوسکتا ہے۔

اسی طرح کرپشن، پھر کرپشن اور دہشت گردی کا گٹھ جوڑ جمہوریت کے لیے ہوش ربا خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے لیکن اربابِ اختیار کو اس کا کوئی شعور نہیں یا پھر ان کے اپنے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں اور خود وہ مسئلے کا حصہ ہیں۔ اس طرح ان سے مسئلے کے حل کی توقع عبث ہے۔

حکومت کی کارکردگی، سوالیہ نشان؟

اس وقت عالم یہ ہے کہ قومی آمدنی کا تقریباً نصف کالے دھن اور کالے کاروبار (بلیک اکانومی) کی شکل اختیار کرچکا ہے۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو جتنا ٹیکس وصول کرنا چاہیے، وہ اس کے نصف سے بھی کم وصول کر رہی ہیں اور ریاست کا کاروبار قرضوں کے سہارے چل رہا ہے۔ زراعت اور صنعت خصوصیت سے ایکسپورٹ انڈسٹری چار پانچ سال سے رُوبہ زوال ہیں۔ حالات کی اصلاح کے لیے کوئی مؤثر پالیسی وضع کرنے میں حکومت ناکام ہے۔ توانائی کا بحران جاری ہے، گیس کی قلت دردِ سر بن چکے ہیں۔ مہنگائی ناقابلِ برداشت ہے، بے روزگاری روزافزوں ہے۔ پاکستانی کرنسی روز بروز بیرونی مارکیٹ میں اپنی قدر کھو رہی ہے۔ ملک سے سرمایہ باہر جارہا ہے اور حکومت ہے کہ محض 'پاک چین راہداری' (سی پیک) کی ڈفلی بجارہی ہے اور باور کرا رہی ہے کہ صرف سی پیک ہی گویا ہمارے سارے معاشی مسائل کا حل ہے۔ ان سب پر مستزاد پانی کی قلّت کا خطرہ اور تیل کے ذخائر کا خطرناک حد تک کم ہوجانا، ہوش اُڑا دینے والی کیفیات ہیں۔ یہ سب کچھ اس وقت ہورہا ہے، جب بھارت نے لائن آف

کنٹرول پر عملاً جنگ برپا کی ہوئی ہے اور تین دریاؤں کے پانیوں کی بوند بوند سے ملک کو محروم کرنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔ یہ ہیں وہ حالات جو جمہوریت کے لیے اندرونی خطرہ ہیں اور اس خطرے کا کوئی ادراک اور اس کے مقابلے کی کوئی تیاری ایوانِ اقتدار میں نظر نہیں آرہی۔

عالمی سطح پر جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور خصوصیت سے امریکا کے حالیہ انتخابات کے نتیجے میں جنوری ۲۰۱۷ء میں جو نئی قیادت امریکا کی زمامِ کار سنبھال رہی ہے، ڈونلڈ ٹرمپ صاحب جس قسم کی ٹیم اپنے صدارتی انتظام و انصرام کے لیے ترتیب دے رہے ہیں اور امریکا، یورپ، جنوبی ایشیا اور شرقِ اوسط کے لیے جن پالیسیوں کا اشارہ دے رہے ہیں، اور خصوصیت سے امریکا بھارت تعلقات اور بھارت کے ذریعے اس علاقے میں جو کردار ادا کرنا چاہتے ہیں، وہ بڑے سنجیدہ اور ٹھنڈے غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ اس مناسبت سے قومی مفادات کے تحفظ اور دیرپا پالیسی سازی کے لیے پوری قوم کو اعتماد میں لینے، قوم کو متحد کر کے اندرونی اور بیرونی خطرات کے مقابلے کی مؤثر منصوبہ سازی وقت کا اہم ترین چیلنج ہے اور اس پورے عمل کے لیے سول اور عسکری قیادت میں مکمل ہم آہنگی ___ وہ پہلو ہے جس کو اولین اہمیت دینے کی ضرورت ہے۔

بلاشبہہ اس پورے عمل میں پارلیمنٹ کا بڑا بنیادی اور مرکزی کردار ہے، لیکن کیا ہماری پارلیمنٹ اپنے اس فرضِ منصبی کا شعور رکھتی ہے؟ اور کیا اس فریضے کی انجام دہی کے لیے کمربستہ ہے؟ کیا ہمارا میڈیا پوری سنجیدگی سے ان موضوعات پر عوام کی تعلیم، بیداری اور انھیں متحرک کرنے میں اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے؟ کیا ہماری سیاسی جماعتیں اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ہیں؟ ہم پوری دردمندی کے ساتھ یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے، تُو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے